مجید امجد کی نظم میں سیاسی شعور

ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان
اسسٹنٹ پروفیسر اردو، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد

POLITICAL VISION
IN MAJEED AMJAD'S VERSE

Anbreen Tabassum Shakir Jan, PhD
Assistant Professor of Urdu, NUML, Islamabad

Abstract

Majeed Amjad is a prominent poet of modern Urdu literature. He is versatile in thematic and stylistic treatment of his poetry. Commonly, Majeed is not considered as a poet manifesting political consciousness or ideology, but if we go through his poetry, we find him a poet with a great political vision. The article attempts to mark the elements of this political vision of Majeed Amjad.

Keywords:

ناصر عباس نیر، عشرت رومانی، میراجی، راشد، اسلم انصاری، وزیر آغا، جیلانی کامران،
عامر سہیل، فیض، یحیٰی امجد

ہر فن کار اپنے فن کا خام مواد اپنے گرد و پیش سے اٹھاتا ہے۔ سماج اور سماجی رویے اس کے تخلیقی رویوں اور رجحانات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی تخلیقات ان رویوں کے تار و پود سے اپنا پیرہن بُنتی نظر آتی ہیں۔ کسی فن کار کا ادب زمان و مکان کی حدوں سے آگے نکل کر آنے والے ادوار تک جا سکتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے عہد سے ناتا توڑ کر مستقبل سے انسلاک اختیار کرتا ہے۔ اس تخلیق یا ادب کے قدم ہمیشہ اپنے ہی عہد میں پیوست ہوتے ہیں۔ لہٰذا کوئی اہم ادبی تخلیق موجود سے گریز نہیں کر سکتی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ناصر عباس نیّر رقم طراز ہیں:

> ہر فنکار اپنی تخلیقات کا پس منظر و پیش منظر اس عہد سے مرتّب کرتا ہے جس میں وہ جی رہا ہوتا ہے۔ اس کی دو بنیادی وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ انسان کا علم اس کے حواس کا مرہونِ منت ہے اور حواس کی کارکردگی موجود سے ماورا انجام نہیں پاتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فنکار اپنے ناظرین کی توجہ مبذول کرانے اور شہرت و مقبولیت سے متکیف ہونے کے لیے ان مسائل کو چُن دیتا ہے جو اس کے عہد میں نمایاں و ممتاز ہوتے ہیں۔(۱)

مجید امجد کی شعری فکریات پر بحث کے دوران میں عموماً ہم ان کی زندگی کے اس پہلو کو پیشِ نظر رکھتے ہیں جو گوشہ نشینی اور خلوت نشینی کا ہے۔ ادبی مراکز اور ادبی محافل سے دور اور ادبی تحریکوں سے بظاہر الگ رہ کر انھوں نے اپنا شعری سفر جاری رکھا۔ اس سے عمومی تاثر یہ لیا جا سکتا ہے کہ شاید وہ دروں بینی کی طرف مائل اور معروض و خارج کے مسائل سے کسی حد تک گریزاں ہیں۔ مگر مجید امجد کی نظموں کا سرسری مطالعہ بھی اس تاثر کو زائل کر دیتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاں گرد و پیش کے مسائل اور زندگی کی صورت حال کا گہرا ادراک اور شعور ملتا ہے جسے انھوں نے داخلی کیفیات کے ساتھ ملا کر پیش کیا۔ اس ضمن میں عشرت رومانی رقم طراز ہیں:

> اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے شعری سفر کے ابتدائی اور درمیانی مہ و سال میں مجید امجد نے دونوں عالمی جنگوں کے متعلق بہت کچھ سوچا ہوگا جس نے ان

کے تصورِ حیات پر گہرے نقوش بنائے ہوں گے اور نئی جہتوں سے آشنا کیا ہوگا۔ اسی طرح ترقی پسند تحریک نے بھی نئے راستے دکھائے ہوں گے۔ اگر چہ وہ عملی طور پر اس میں شریک نہیں رہے، جس کی بنیادی وجہ ان کی خلوت نشینی تھی۔ وہ تو ایک درویش صفت انسان تھے جو ساہیوال کے ایک کمرے میں رہ کر لوگوں کو نئے راستے دکھاتے اور آنے والے زمانوں سے خبر دار کرتے تھے۔۔۔ انھوں نے نئے نظام کے بے شمار خواب دیکھے تھے جس نے ان کے فکری سفر کو نئی وسعتوں اور آفاقی جذبوں سے آشنا کیا۔ انھیں یقین تھا کہ آنے والی روشن کرنیں کبھی نہ کبھی تاریک راستوں میں جگمگائیں گی۔ اس تناظر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں جو روشنی پھیلے گی وہ ایک نئے نظام کو اس طرح منور کرے گی کہ زندگی کے خد وخال فطری حالات میں نظر آئیں گے۔(۲)

مجید امجد ان مسائل کے ادراک اور تفہیم میں اپنے معاصر لکھنے والوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں رہے اور جدید نظم کا فکری دائرہ وسیع کرنے میں قابلِ قدر کردار ادا کیا۔۔ بقول ڈاکٹر اسلم انصاری:

'ان کا تخلیقی شعور خارجی حقائق کے ادراک اور داخلی واردات کے متشکل ہونے کا ایک انوکھا نقطۂ اتصال تھا۔ اگر چہ ہر سچے شاعر کا تخلیقی شعور کم وبیش یہی وظیفہ سر انجام دیتا ہے لیکن مجید امجد کے یہاں تخلیقی تجربہ کئی راستوں سے ہوتا ہوا اور کئی جہتوں کی نقش گری کرتا ہوا ایک ایسا معنوی پیرایہ اختیار کرتا ہے جو اپنے ہی جیسے ایک بے حد انوکھے اور منفرد لفظی اسلوب کے ساتھ پیوست ہوتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ میرا جی اور راشد کی طرح مجید امجد نے بھی نظمِ جدید کے فکری آفاق میں بے حد وسعت پیدا کی ہے'۔(۳)

مجید امجد کے آس پاس کے شعری رویوں میں دو زیادہ نمایاں تھے۔ ایک ترقی پسند رویہ اور دوسرا رومانوی۔ اس وقت کے زیادہ تر لکھنے والے انھی میں سے کسی ایک کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے اور فکری اور اسلوبیاتی سطح پر اس کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بعض شاعروں کے ہاں یہ دونوں رویے ملتے ہیں خصوصاً ان شعرا کے ہاں جنھوں نے رومانوی تحریک میں اپنا شعری سفر بیسویں صدی کی

تیسری دہائی میں شروع کیا جب رومانوی تحریک اپنا دورِ عروج دیکھ کر اپنی مقبولیت کھو رہی تھی اور اگلی دہائی میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا جس نے بڑے پیمانے پر ادبی فکر کو متاثر کیا۔ اس دور کے شعرا کے ہاں رومانوی اور ترقی پسند دونوں رویے پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ فیض، مخدوم محی الدین، مجاز، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر اور دیگر کئی شاعروں کے نام اس سلسلے میں گنوائے جا سکتے ہیں۔ لیکن مجید امجد نے ان دونوں رویوں سے جدا اپنا راستہ بنانے کی کوشش کی۔ بقول ڈاکٹر اسلم انصاری:

> انھوں نے بہت آہستگی سے چالیس کی دہائی کی رومانوی اور انقلابی نظم گوئی سے اپنا راستہ الگ کیا لیکن رومانویت اور ترقی پسندانہ انقلابی روش کے بہترین اجزا کو ضائع نہیں ہونے دیا بلکہ انھیں ایک نئے تخلیقی تجربے کا حصہ بنا کر جدید اردو نظم اور اردو شاعری کو ایک یکسر نیا وژن عطا کیا۔ (۴)

اس نئے شعری وژن میں جہاں سائنسی شعور، تصورِ زماں اور ہیئت و آہنگ سے متعلق اجتہادی روش جیسے دیگر کئی عناصر شامل ہیں وہاں سیاسی شعور بھی ایک لازمے کی طرح موجود ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مجید امجد کی اوّلین ترجیح بذاتِ خود ادب ہی رہا ہے اور شاعری میں ان کا نمایاں مقصد ادبی اقدار کی پاس داری ہی رہی ہے لیکن ان کے موضوعاتی دائرے کی وسعت اس امر کی مظہر ہے کہ انھوں نے اپنے گرد و پیش کی صورتحال کو نہ صرف دیکھا اور محسوس کیا ہے بلکہ اسے اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بنا کر اسے اپنی نظموں کی صورت بھی دی ہے۔ ان کی سیاسی اور سماجی بصیرت اپنے ہم عصروں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> اس (مجید امجد) کا مسلک اس بات سے ظاہر ہے کہ اس نے یہ نظمیں محض تسکینِ ذوق کے لیے لکھی ہیں، کسی نظریاتی مسلک کے تابع ہو کر نہیں لکھیں۔ گو ان میں معاشرے کی کروٹوں کا جو شعور جھلکتا ہے وہ ڈھول تاشوں کے ساتھ نظریاتی پراپوگنڈہ کرنے والوں کے شعور سے کہیں زیادہ پختہ اور جاذبِ نظر ہے۔ (۵)

مجید امجد ان سارے مسائل کا ادراک رکھتے تھے جو طبقاتی نظام اور عدم مساوات پر مبنی معاشی

نظام نے انسان کے لیے پیدا کرر کھے تھے۔ان مسائل کا یہ ادراک ان کے اس شعری وژن کی وجہ سے تھا جو انھیں بالواسطہ نہیں ملا تھا بلکہ ان کے ذاتی تجربات ومشاہدات اور ان کا اپنا سماجی مرتبہ ان کے اس تخلیقی نظریے کی بنیاد میں موجود تھا۔ جیلانی کامران نے بھی مجید امجد کی نظموں کو ان کے عہد کے پس منظر میں دیکھتے ہوئے اسی طرح کی رائے دی ہے۔ ان کے بقول 'قیامِ پاکستان کے وقت اردو نظم رومان اور احتجاج کے رجحانات کی دستاویز تھی۔ اور یہ رجحانات اردو نظم کی فکری سرشت میں بہت گہرے تھے۔نئی اردو نظم کے ساتھ رجحانات کے مرکز سے جو تخلیقی 'انا' پیدا ہوئی اس نے رومان اور احتجاج کے رویوں میں میٹافزکس کو شامل کر کے ان رویوں کو ایک بدلا ہوا مفہوم دیا۔تاہم رومان اور احتجاج کے روایتی رجحانات بھی برابر اردو نظم میں ظاہر ہوتے رہے۔۔۔ مجید امجد کی نظموں میں بھی ان رجحانات کی صورت دکھائی دیتی ہے مگر مجید امجد کی نظموں میں ان رجحانات کی مدد سے انسانوں کی جو دلآویز تصویر برآمد ہوئی ہے وہ ان کے ہم عصر شعرا میں بہت کم دکھائی دیتی ہے'۔(۶)

اسی زمانے کے بہت سے معروف شاعر و ادیب انسانی اقدار کی پامالی اور سماجی عدم مساوات کے خلاف موثر انداز سے اپنی تخلیقات پیش کر رہے تھے۔ ان کی تحریروں کی تاثیر اپنی جگہ لیکن ان میں سے زیادہ تر کا تعلق ان مسائل کے ساتھ علمی نوعیت کا تھا۔ یہ مسائل ان تک خبر کی طرح پہنچے تھے لیکن مجید امجد ان سارے مسائل سے بحیثیت ایک انسان کے ذاتی سطح پر شناسائی رکھتے تھے۔وہ مسائل جو کسی غمگین انسان یا انحطاط پذیر معاشرے کے ہو سکتے تھے وہ ان مسائل سے بذات خود دوچار تھے۔ لہٰذا انھیں ان کا ادراک بھی اسی قدر زیادہ تھا۔

فیض کا ذکر ترقی پسند شعری مکتبہ فکر کے اساسی شاعر کے طور پر ہوتا ہے۔ان کے ہاں جو خاص سیاسی وطبقاتی شعور ہے اس کے تناظر میں فیض جس انسان کا تصور سامنے لاتے ہیں اور جن انسانی مسائل کا احاطہ کرتے ہیں ان کا موازنہ ڈاکٹر عامر سہیل نے مجید امجد کے ہاں موجود اسی طرح کے رویے سے کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

اپنے خاص طبقاتی شعور کے تناظر میں فیض جن انسانی مسائل کو زیر بحث لاتا ہے

مجید امجد کا انسان انہی مسائل کی تفہیم اور تفسیر پیش کرتا ہے۔فیض کا مخاطب انسان ایک پسے ہوئے طبقے کا فرد ہے۔ مجید امجد نے اسی فرد کے مسائل کا نہایت باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے۔فیض اور مجید امجد میں لہجے، اسلوب اور لفظیات کا نمایاں فرق موجود ہے مگر تصورِ انسان کے اعتبار سے دونوں شاعر ایک ہی بنیادی نکتے پر آن ملتے ہیں فرق صرف مشاہدے اور اظہار کا ہے۔(۷)

یعنی فیض اور مجید امجد دونوں کے پیشِ نظر جو انسان ہے اس کی نوعیت مشترک ہے اور اس انسان کے بارے میں دونوں کا رویہ بھی ایک ہی ہے کہ دونوں اس کو گرداب سے نکال کر ساحل تک لانا چاہتے ہیں۔دونوں کا راستہ الگ ہوسکتا ہے مگر مطمحِ نظر ایک ہے۔ جب دونوں شاعر ایک جیسا عصری پس منظر رکھتے ہیں، دونوں کا بنیادی انسانی تصور مماثلت رکھتا ہے، دونوں انسانی مسائل کی تفہیم کرتے ہیں اور ایک کی آواز میں ہمیں عصری سیاسی شعور نظر آتا ہے تو دوسرے کی آواز اس سے عاری کیونکر ہو سکتی ہے۔فیض اور مجید امجد کے تصورِ انسان کی یکتائی پر ہی موقوف نہیں بلکہ بعض جگہوں پر تو ان کے شعری لہجے میں بھی مماثلت نظر آتی ہے۔مجید امجد کے یہ اشعار دیکھیے:

جس جگہ روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہیں مدام سیم و زر کے دیوتاؤں کے سیہ قسمت غلام
جس جگہ اٹھتی ہے یوں مزدور کے دِل سے فغاں فیکٹری کی چمنیوں سے جس طرح نکلے دھواں
جس جگہ دہقاں کو رنجِ محنت و کوشش ملے اور نو ابوں کے کتّوں کو حسیں پوشش ملے
تیرے شاعر کو یقیں آتا نہیں ، ربّ العلا! جس پہ تو نازاں ہے اتنا، وہ یہی دنیا ہے کیا!

(''یہی دنیا''، کلیاتِ مجید امجد)

اس نظم سے مجید امجد کا نام ہٹا دیا جائے تو اس پر کسی بھی ترقی پسند شاعر کی تخلیق ہونے کا گمان ہوسکتا ہے۔اس اقتباس میں موجود اشعار کے لب و لہجے ہی نہیں بلکہ الفاظ میں بھی سیاسی شعور کی وہی رَو موجود ہے جو اس زمانے کی شاعری کی معروف لَے ہے اور جسے خصوصیت سے ترقی پسند تحریک کا لب ولہجہ کہا جاسکتا ہے۔

ان معروضات کا مقصد مجید امجد کو نہ تو ترقی پسند شاعر کے طور پر پیش کرنا ہے اور نہ ان کے سیاسی وعصری شعور کا کسی ترقی پسند شاعر سے موازنہ مقصود ہے۔ مدعا یہ کہنا ہے کہ مجید امجد کی شاعری اور ان کے پیرایۂ بیان میں بھی اس سیاسی شعور کی کارفرمائی کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے جو ان کے دور کے اجتماعی سیاسی شعور کا حصہ ہے۔ مجید امجد کی زندگی میں شائع ہونے والی ان کی واحد کتاب ''شب رفتہ'' میں اس طرح کی متعدد نظمیں موجود ہیں جن میں سماجی ومعاشی اور طبقاتی رویوں پر مجید امجد کے احساسات منظوم صورت میں کہیں واضح طور پر اور کہیں پنہاں صورت میں موجود ہیں۔ بلراج کومل کہتے ہیں:

> 'شب رفتہ' اور 'مرے خدا مرے دل' کا شاعر خالص عمومی سطح پر معاشرے کا پیدا کیا ہوا عام انسان ہے۔ اس لیے وہ دورانِ سفر کئی بار جسمانی اور ارضی سطح پر عام انسان کی باتیں کرتا ہے جو یا تو وہ خود ہے یا اس کا ہم عصر شہری ہے۔(۸)

مجید امجد عام انسان کی باتیں کرتے ہیں اور وہ عام انسان یا تو وہ خود ہیں یا ان کے گرد و پیش میں اسی طرح کا ان کا کوئی ہم وطن شہری ہے۔ گویا سماجی ادراک مجید امجد کے ہاں ذاتی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر موجود ہے۔ ذاتی سطح پر مجید امجد ایک ایسے انسان کی نمائندگی کرتے ہیں جو معاشی اور سیاسی اقدار کے شکنجے میں کسا ہوا ہے۔ پسماندگی، ناانصافی اور غربت جیسی ساری آفتوں کا سامنا کرنا ان کے ذاتی تجربات میں شامل ہے۔ مجید امجد یہاں ایک ایسے حساس انسانی کردار کے طور پر سامنے آتا ہے جو اس معاشی عدم مساوات اور طبقاتی نظام کا شکار ہونے پر جب ردِعمل کا اظہار کرتا ہے تو اس کے اس ردِعمل میں اس کی ذات کا کرب بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ذات پر جھیلے دکھ کا کرب جب ان کی آواز کا حصہ بنتا ہے تو مجید امجد کا لہجہ ایک منفرد رنگ و آہنگ اختیار کر لیتا ہے جو انھیں اپنے عہد کی دیگر آوازوں کے سیاسی آہنگ سے ممتاز بنا دیتا ہے۔ بقول یحییٰ امجد:

> مجید امجد کی شاعری کا مرکزی کردار نچلے متوسط طبقے کو اور اس سے بھی نیچے کی زندگی کو دیکھتا ہے مگر اوپر کھڑے ہو کر نہیں، شفقت اور مربیانہ مہربانی سے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ خود اس کا حصہ ہے یا خود کو اس کا حصہ محسوس کرتا ہے۔(۹)

مجید امجد کے عہد میں ایک رویہ فیشن کے طور پر ابھر کر سامنے آیا تھا کہ اونچے طبقے اور اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے ادیب اور دانش ور انقلاب اور سماجی تبدیلیوں کی بات کرتے تھے، عام انسانوں، مزدوروں، پیشہ وروں کے حقوق کے تحفظ کی باتیں کرتے تھے۔ وہ بظاہر پروتاری لہجے اور پیرائے میں مضامین اور تقریریں منظرِ عام پر لاتے تھے مگر فی الحقیقت وہ خود اسی طبقے کا حصہ تھے جس کی وہ اپنی تقریروں اور مضامین میں مذمت کرتے تھے۔ وہ نچلے طبقے کے زبانی خیر خواہ اور اونچے طبقے کا عملاً حصہ تھے۔ یہ لوگ عوام سے جڑنے کی بات کرتے تو تھے مگر محض جلسے جلوسوں اور سیمیناروں میں، اور ان کی یہ جڑت اپنے اُس کھوکھلے کردار کو بچانے کی غرض سے ہوتی تھی جس کے بل بوتے پر وہ عوام کی محبت اور خواص کا قرب حاصل کرتے تھے۔ ان کے لیے عوام، مزدور، کسان اور غریب وہ ہتھیار تھے جنھیں استعمال کر کے وہ سیاست، معاشرت اور ادب میں بہت کچھ پا رہے تھے۔ مجید امجد ان نام نہاد عوام دوستوں اور بہروپیے خیر خواہوں کی دنیا سے الگ جہان کے باسی تھے۔ اس حوالے سے حمید نسیم لکھتے ہیں کہ 'مجھے کلیات کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوا کہ مجید امجد فطری طور پر فقیر منش ہیں۔ صورتحال کے خلاف ہونا ان کے لیے ایک فطری تقاضا ہے۔ صرف ایک فیشن ایبل تحریک سے وابستگی کا اظہار نہیں۔' (۱۰) مجید امجد کو عوام سے جڑنے کا نعرہ لگانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ عوام میں سے تھے۔ انھیں عوام کی سطح پر اتر کر عوام کے جذبات کو سمجھنے کے لیے کسی وسیلے کی ضرورت نہ تھی۔ لہٰذا انسان دوستی، عوام کا درد اور عام آدمی سے ذہنی و قلبی وابستگی مجید امجد کا بے ساختہ تجربہ اور اس کے فکر کا بنیادی حصہ بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ یحییٰ امجد کے لفظوں میں:

> ۔۔۔ مجید امجد کو ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ وہ خود بخود عوام سے جڑا ہوا تھا کیونکہ وہ انھیں میں سے تھا۔ اس کا ان سے جڑنا تبلیغ انقلاب کے لیے نہیں تھا۔ نہ ان اَن پڑھوں اور بے وقوفوں کو عقل سکھانے کے لیے تھا بلکہ اس لیے تھا کہ وہ وہی تھا۔ وہ ذہنی طور پر بھی ان کے ساتھ تھا۔ لہٰذا ان کا مشاہدہ انھی کی آنکھ سے اور انھی کے جذبہ واحساس کے ساتھ کرتا تھا۔ (۱۱)

یہی وجہ ہے کہ مجید امجد کے ہاں فن اور شخصیت میں کوئی تضاد نہیں ملتا۔ ان کی شاعری کی داخلیت اور ان کی زندگی کی خارجیت میں پوری ہم آہنگی موجود ہے۔(۱۲)

عام آدمی کی سی زندگی گزارنے اور عام آدمیوں سے قربت کا تجربہ رکھنے کا ایک نمایاں اثر ہم مجید امجد کی شعری زبان پر بھی دیکھتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر ابرار احمد 'مجید امجد تفصیل پسند اور جزئیات نگاری پر توجہ دینے والے شاعر تھے۔ ان کی نظموں کا کمال یہ ہے کہ وہ بول چال اور روزمرہ کی زبان کے بہت قریب چلے جاتے ہیں۔ جدید تر اور ہمہ وقت پیچیدہ ہوتی زندگی کے مسائل ۔۔۔کو سمجھنے کی کوشش نے ان کی نظم کو ہمہ جہت اور منفرد بنادیا ہے۔'(۱۳) اسی سے ملتی جلتی رائے ڈاکٹر عامر سہیل کی بھی ہے جو مجید امجد کی شعری زبان کو ان کی سماجی زندگی شخصیت کا پرتو قرار دیتے ہیں: 'مجید امجد نے شعری لفظیات کا جو نظام قائم کیا ہے اس میں ان کی تخلیقی اور سماجی شخصیت دونوں سما گئی ہیں۔ ان کی شاعری کا خمیر اسی دھرتی سے اٹھا ہے۔ وہ اپنی روایت سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ ابتدائی کلام میں فارسی اور عربی اثرات اسی تناظر میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں مگر رفتہ رفتہ وہ شعری مزاج کے مطابق لفظیات کا چناؤ کرتے اور انھیں برتتے ہیں۔ ان کے یہاں لفظ کی معنویت یک رخی یا اکہری نہیں بلکہ مختلف جہتوں میں سفر کرتی ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ ان کا ہر لفظ اپنی خاص تہذیبی شناخت کے رنگ میں رنگا ہوتا ہے'۔(۱۴)

جبر کے خلاف آواز اٹھانا اگر سیاسی اور سماجی شاعری کا معیار قرار دیا جاتا ہے تو مجید امجد کے ہاں یہ آواز کئی سطحوں پر موجود ہے۔ اس کے مقابلے میں اس کے عہد کے بعض معروف حقیقت پسندوں کے ہاں یہ آواز نہ صرف اکہری ہے بلکہ اس کے خدوخال بھی واضح نہیں ہیں۔

وقت کا تصور مجید امجد کی فکریات کا نمایاں پہلو ہے۔ 'مجید امجد نے ''وقت'' کی پہیلی کے مختلف پہلوؤں پر کہیں جذبے کی سطح پر اور کہیں فکر کی سطح پر غور کیا ہے۔'(۱۵) مجید امجد کے تصور وقت پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت کو بے انتہا طاقت ور اور بے نیاز سمجھتے ہیں جو بذات خود جبر کا ایک سلسلہ ہے۔ ایسا جبر جس کی وسعت وطوالت باقی ساری جبری قوتوں کے مقابلے میں لامحدود و بے انتہا ہے،

جس کے سامنے کائنات والے کیا بذاتِ خود کائنات ہی بے بس ہے۔ وقت کے اس جبر کو سمجھنا دراصل ایک تدریجی عمل کا نتیجہ ہے۔ ذات پر مسلط جبر اس تدریجی عمل کا پہلا زینہ ہے۔ سماج میں موجود جبری ہتھکنڈے اس کی انگلی کڑی ہے۔ اپنی ذات اور سماج میں موجود جبری عناصر مجید امجد کو جبر کے اس سلسلے کی طرف دیکھنے کی تحریک دیتے ہیں جو ازلی اور ابدی ہے۔

مجید امجد کی معروف نظم ''کنواں'' ان کے تصورِ وقت کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے۔ مگر تصورِ وقت تو نظم کی بہت سی پرتوں میں سے ایک ہے۔ اس سے پہلے اس نظم کی ظاہری سطحوں پر سماجی اور تہذیبی ارتقا کو اس عہد کی غیر یقینی صورتِ حال کے پس منظر کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ بقول سید عامر سہیل:

> مجید امجد کے یہاں انسان اور معاشرے کو قدیم تاریخی اور تہذیبی تناظر سے لے کر جدید عصری تقاضوں کے مطابق دیکھا اور پرکھا گیا ہے۔ مجید امجد کی نظم ''کنواں'' میں بھی ازل سے قائم تاریخی، معاشرتی، سماجی اور تہذیبی ارتقا کو اپنے عہد کی بے یقین صورتحال کے پس منظر میں دکھایا گیا ہے۔ اس طرح یہ نظم زندگی کے ارتقا کی بلیغ علامت کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے۔(۱۶)

نظم کا تجزیہ کیا جائے تو کنواں چلنے کے باوجود کھیت اجڑے اور سوکھے پن کا شکار نظر آتے ہیں۔ کنویں کا چلنا اگر زندگی سے تعبیر کیا جائے تو سوکھے اور بنجر کھیت اس زندگی میں لاحاصلی کا نشان بن کر سامنے آتے ہیں۔ کنواں وسائل کا منبع ہے مگر ان وسائل کے حق دار اسی طرح تہی دست اور سوکھے کھیتوں کی طرح تشنہ لب نظر آتے ہیں۔ اس زمانے کی سیاست کو مدنظر رکھیں تو سامراجی قوتوں کے جبر کا شکار ہندوستانی سماج جس طرح بنیادی انسانی اقدار سے محروم ہو رہا ہے اور اس محرومی کا ازالہ بھی نہیں ہو رہا تو اس کے نتیجے میں اس دور کے انسان کی محرومی کھیتوں کے بنجر پن کے مصداق کہی جا سکتی ہے۔

اس نظم میں بہت سی علامات ہیں جو عصری حالات کو ظاہر کرتی ہیں۔ بیلوں کا جوڑا جو ایک مرکز مائل قوت کے زیر اثر ہے اپنی خواہش کے برعکس مسلسل چکر کاٹ رہا ہے۔ نوآبادیاتی نظام میں جکڑا انسان بھی ایک ایسے ہی دائرے میں گھومنے والا بیل ہے جس کے مقدر میں بھاری سلاسل، کڑکتے

ہوئے آتشیں تازیانے، یوں لگتا ہے ازل سے ابد تک لکھ دیے گئے ہیں۔ یہ نہ ختم ہونے والا جبر گویا کنویں کے گرد دائرے کا سفر ہے۔نوآبادیاتی سماج میں بسنے والے مجبور ومحکوم انسانوں کی نہ ختم ہونے والی بے اختیاری کا سفر ہے۔گادی پر لیٹا شخص سامراجی نظام کا آلۂ کار ہے جو اس نظام کی بقا اور تسلسل کو قائم رکھنے پر مامور ہے۔اس بند میں ''نظامِ فنا'' کی ترکیب کائنات کی طرف مجموعی اشارے کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی نظام میں جکڑے ہوئے انسان کی وہ خواہش بھی ہو سکتی ہے جو اس نظام کی تباہی اور فنا سے جڑی ہوئی ہے۔اس نظم کے پس منظر میں کارفرما سیاسی اور عصری شعور کے بارے میں ڈاکٹر عامر سہیل لکھتے ہیں:

> سامراجی اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف ترقی پسند نظریات نے خوب مقبولیت حاصل کی۔اس طرح ادب میں ترقی پسند اسلوب عام ہوتا چلا گیا۔مجید امجد اس تحریک میں باقاعدہ طور پر شامل نہیں تھے۔اور نہ ہی ان کا اسلوب ترقی پسند اسلوب سے لگا کھاتا ہے۔مگر اس عہد میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے پس منظر میں مجید امجد فکری اعتبار سے ترقی پسندوں کے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ ان کی نظم ''کنواں'' اس کی بہترین مثال ہے۔(۱۷)

ڈاکٹر عامر سہیل نے جس بنا پر مجید امجد کو ترقی پسندوں کے قریب کہا ہے وہ دراصل سیاسی وسماجی ادراک کی ایک بلند ترسطح ہے جس کی پیش کش کو مجید امجد اپنے اسلوب کی ندرت کے باعث اپنا امتیاز بناتے ہیں۔ یہ پیرائیہ بیان اس قدر منفرد ہے کہ اس کی نظیر اس زمانے میں ہی نہیں اس کے پہلے یا بعد میں ملنا بھی مشکل ہے۔مجید امجد کا یہ اسلوب دراصل اس فنی رویے کا عکاس ہے جو تقلید کے بجائے اجتہادی رویے سے اعتنا کرتا رہے۔تاج سعید لکھتے ہیں:

> مجید امجد کی شاعری خنک سایوں اور نرم جھونکوں کی شاعری ہے۔اس نے اظہار کے جو سانچے بھی وضع کیے ہیں، ان میں نرمی اور دھیما پن ہے۔تندخو اور چیختی چلاتی دنیا نہیں ہے۔اس کے آس پاس کا ماحول بھی شاید ایسا ہی تھا، تبھی اس نے

ساری عمر ساہیوال کے بلند و بالا سایہ دار درختوں کے نیچے گزار دی۔۔۔لفظ کی حرمت اور اس کی تقدیس کا مجید امجد بے حد قائل تھا۔لہذا اس نے کسی لفظ کو بے آبرو نہیں کیا۔اس نے ہر حرف کی معنویت اور اس کے وقار کو قائم رکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی اس کی شاعری کی عظمت کی دلیل ہے۔(۱۸)

''قیصریت'' ۱۹۳۹ء میں لکھی گئی مجید امجد کی وہ نظم ہے جس کی بنا پر بعض لوگوں نے انھیں کمیونسٹ بھی کہا ہے۔ یہ نظم دراصل مجید امجد کی اس فکری عمارت کی بنیاد کہی جا سکتی ہے جس سے کنواں جیسی نظمیں تخلیق پاتی ہیں۔ یہ نظم اپنے زمانے کی وہ تصویر بناتی ہوئی نظر آتی ہے جس کے منظرنامے پر سامراجی قوتوں کے استحصالی رویے کے چھینٹے واضح نظر آتے ہیں:

اس سپاہی کا وہ اکلوتا یتیم — آنکھ گریاں، روح لرزاں، دل دونیم
بادشہ کے محل کی چوکھٹ کے پاس — لے کے آیا بھیک کے ٹکڑے کی آس
اس کے ننگے تن پر کوڑے مار کر — پہرے داروں نے کہا دھتکار کر
کیا ترے مرنے کی باری آ گئی — دیکھ وہ شہ کی سواری آ گئی
وہ مڑا چکرایا اور اوندھا گرا — گھوڑوں کے ٹاپوں تلے روندا گیا
دی رعایا نے صدا ہر سمت سے — ''بادشاہ مہرباں! زندہ رہے''

(''قیصریت''، شب رفتہ)

بے بسی کی اس موت پر مجید امجد کے ردِعمل کے حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیّر لکھتے ہیں:

مجید امجد نے موت کو جب کسی بھی ذی حیات پر طاری ہوتے دیکھا ہے تو بھی اپنے اندر ڈوب گئے ہیں اور ایک ذاتی ردِعمل ظاہر کیا ہے۔ یہ ردِعمل دو طرح کا ہے طنز یہ اور دردمندانہ۔طنز یہ ردِعمل وہاں ظاہر ہوا ہے جہاں وہ قوت کو سماج کی طرف سے وارد ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔ یہاں وہ سماج کے لیے روح اور میکانکی رسوم و روایات کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں، جو فرد سے بطور ایک انسان تعرض نہیں کرتیں۔(۱۹)

''دنیا'' ۱۹۴۰ء میں لکھی گئی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کو شروع ہوئے ابھی ایک سال ہی ہوا تھا۔ جنگ کی ہولناکیاں اگرچہ پورے طور پر سامنے نہیں آئیں تھی مگر ایک ایسی جنگ کی شروعات ہو چکیں تھیں جس کے بھیانک انجام کے بارے میں ابھی کسی نے وہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ جو ۱۹۴۵ء میں اس کا انجام بنا تھا۔ تاہم اس جنگ کے ایندھن کے طور پر نوآبادیاتی ممالک سے لوگ بھرتی کیے جا رہے تھے۔ ماؤں سے ان کے لختِ جگر، بہنوں سے ان کے جواں سال بھائی اور نوعمر دلہنوں کے سہاگ ہندوستان سے دور ایک ایسی جنگ لڑنے میں مصروف تھے جس کے سیاسی عزائم سے یہ بھولے سپاہی قطعاً بے خبر تھے۔ اس بات کا اظہار مجید امجد کی گذشتہ سطور میں تجزیہ کی گئی نظم قیصریت میں بھی نظر آتا ہے۔ تاہم ''دنیا'' ایک ایسی نظم ہے جو اس جنگ کی ہولناکیوں کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آتی ہے۔ (۴۰)

قیصریت (۱۹۳۹ء) اور دنیا (۱۹۴۰ء) سے پہلے کی ایک نظم ''نفیرِ عمل'' ہے۔ یہ ۱۹۳۸ء میں لکھی گئی۔ ''نفیرِ عمل'' میں اپنے نام کے لغوی معنی کی پوری جھلک موجود ہے۔ شاعر اس نظم میں اپنے وطن کے نوجوان سے مخاطب ہے، اس کو تقدیر پر قانع رہنے کے بجائے تدبیر اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ دراصل اس نظم کے بین السطور مجید امجد کے ہاں اپنے ملک بلکہ دنیا کے سیاسی حالات کی اہمیت سے واقفیت نظر آتی ہے۔ دعوتِ عمل وہی دے سکتا ہے جسے عمل کی ضرورت اور افادیت کا علم ہوتا ہے۔ اور یہ علم اسے ہی ہو سکتا ہے جس کی اپنے معاشرے اور اپنے گرد و نواح کے سیاسی رویوں اور رجحانات پر گہری نظر ہو۔ مجید امجد کا کمال یہ ہے کہ گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے کے باوجود ان کی دنیا اور اس کے معاملات سے آگہی بلند تر سطح پر موجود ہے۔ ایسی سطح جہاں سے شاعر اپنے ہم وطنوں سے اس طرز اور اس لہجے میں بات کرتا ہے:

جامِ جم سے نہ ڈریں شوکتِ کے سے نہ ڈریں   حشمتِ رُوم سے اور صولتِ رَے سے نہ ڈریں
ہم جواں ہیں تو یہاں کی کسی شے سے نہ ڈریں   ہم جواں ہیں تو نہ کچھ خدشۂ آلام کریں
نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

(''نفیرِ عمل''، کلیاتِ مجید امجد)

جامِ جم، شوکتِ کَے، حشمتِ روم اور صولت رَے جیسی تاریخی علامتیں دراصل اس جبر کی نشاندہی کر رہی ہیں جو مجید امجد کے زمانے میں سامراجی قوتوں اور ان کے دُم چھلوں کے اس شہنشاہی فکر کو ظاہر کرتی ہیں جو ان کے حکمرانی کے بنیادی اصول تھے۔ مجید امجد نے ان ''اصولوں'' کی عمل داری اپنے معاشرے پر ہی نہیں بلکہ اپنی ذات پر بھی ہوتے دیکھی تھی۔ ان کے سامنے پھیلے معاشرے میں کیڑے مکوڑے جیسی رعایا کے اوپر نہ جانے کتنے قیصر، کتنے کسریٰ اور کتنے جمشید مختلف صورتوں اور روپ میں موجود تھے۔ ان کی حکمرانی کی سفاکی مجید امجد کے مشاہدے ہی میں نہیں تھی بلکہ انھیں ان رویوں سے عملی شناسائی بھی تھی۔

مجید امجد خواب گر تھے۔ ان کے خوابوں کی دنیا بھی ان کی اپنی ذات کی طرح ایک الگ اور ممتاز حیثیت رکھتی تھی۔ ان کے یہ خواب اگر چہ ان کی اپنی ذات کے اندر سے پھوٹتے تھے مگر ان کی تعبیر میں ان کی ذات کے علاوہ باقی ساری دنیا اور نسل کا حصہ بھی موجود تھا۔ ان کے خواب آئندہ کے خواب تھے اور ان خوابوں کی تعبیر کے حصول میں مجید امجد اور ان کی نسل کا جو امروز داؤ پر لگ گیا تھا تو انھیں اس کا غم نہیں تھا بلکہ اس بات کی خوشی تھی کہ وہ خواب جو انھوں نے اور ان کی نسل نے دیکھے تھے انھیں آنے والی نسلیں تعبیر کی صورت میں دیکھیں گی۔ نظم ''پھولوں کی پلٹن'' میں مجید امجد نے نسلِ نو کی خوشحالی پر جو خوشی کا اظہار کیا ہے وہ اس کے اس سماجی شعور کی بدولت ہے جو انھیں نسلِ انسانی کی بقا اور فلاح سے حد درجہ انسلاک کی رغبت عطا کرتا تھا۔ اسی لیے ان کو وہ خوشی بھی اپنی خوشی لگتی ہے جو اگر چہ انھیں تو میسر نہیں آسکی مگر اس کے بعد اور آنے والی کسی نسل کے فرد کو حاصل ہوگئی ہے۔ من کی دنیا کے باسی کا یہ رویہ سیاسی و سماجی ہر دو معنوں میں جذبۂ انسانیت سے سرشار نظر آتا ہے:

اجلے اجلے پھولوں کی پلٹن میں چلنے والو
تمھیں خبر ہے، اس فٹ پاتھ سے تم کو دیکھنے والے
اَب وہ لوگ ہیں
جن کا بچپن ان خوابوں میں گزرا تھا جو آج تمہاری زندگیاں ہیں!
(''پھولوں کی پلٹن''، شبِ رفتہ کے بعد)

مجید امجد کی یہ خوبی ہے کہ ایک طرف تو وہ نسلِ نو کی خوشی اور فلاح کے خواب دیکھتے ہیں تو دوسری طرف انھیں اس حقیقت کا بھی ادراک ہے کہ عام آدمی کے خواب بہت جلد تعبیر کی منزل سے ہم کنار نہیں ہوتے۔ برس ہا برس گزر جاتے ہیں اور خواب بنتے ٹوٹتے رہتے ہیں۔ کسان کا بچہ کسان، مزدور کا بیٹا مزدور، غلام کا بیٹا غلام اور پنواڑی کا بیٹا پنواڑی ہی بن سکتا ہے۔ یہی وہ تلخ حقائق ہیں جو مجید کی شعری کائنات کو بسا اوقات سر ریئلسٹ نقطہ نظر اختیار کرنے پر راغب کرتے ہیں۔ سماج کا جبر جب حد سے زیادہ ہو جاتا ہے تو اس کا علاج ایک شاعر کی نظر میں ان حقائق سے انکار ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے جو حقائق تو ہوتے ہیں مگر انھیں قبول کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ''پنواڑی'' نظم میں انہی تلخ حقائق کی گونج موجود ہے:

عمر اس بوڑھے پنواڑی کی پان لگاتے گزری
چُونا گھولتے ، چھالیا کاٹتے ، کتھ پگھلاتے گزری
سگرٹ کی خالی ڈبیوں کے محل سجاتے گزری
کتنے شرابی مشتریوں سے نین ملاتے گزری
چند کسیلے پتوں کی گتھی سلجھاتے گزری

(''پنواڑی''،شبِ رفتہ)

پنواڑی کا یہ کردار مجید امجد کے معاشرے کا وہ جیتا جاگتا کردار ہے جس میں سب سے پہلے تو اس کی اپنی ذات فٹ ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس معاشرے میں پھیلے ''پنواڑیوں'' کا ایک وسیع سلسلہ نظر آتا ہے جو ساری عمر مصائب کے چونے کی ترشی سے ہاتھ جلانے، راہِ زیست میں استادہ پہاڑ کاٹنے اور اپنے لہو کی حرارت سے پتھر دل سماج کو اپنے حق میں پسیجنے کی ترغیب دیتے ہیں اور گتھیوں کو سلجھانے میں ان کی ساری صبحیں، ساری شامیں، سارے دن اور ساری راتیں لگ جاتی ہیں اور آخر کار بقول مجید امجد:

کون اس گتھی کو سلجھائے ، دنیا ایک پہیلی
دو دن ایک پھٹی چادر میں دکھ کی آندھی جھیلی

دو کڑوی سانسیں لیں ، دو چلموں کی راکھ انڈیلی
اور پھر اس کے بعد نہ پوچھو ، کھیل جو ہونی کھیلی
پنواڑی کی ارتھی اٹھی ، بابا اللہ بیلی

(''پنواڑی''، شبِ رفتہ)

زندگی کو زندگی بنانے کی ساری کوششیں اور سارے جتن کرنے کے بعد بھی پنواڑی اپنی دکان میں سجی سگریٹ کی خالیوں ڈبیوں کی طرح ایک خالی خولی دل لیے اپنی ارتھی پہ جا لیٹ گیا مگر کیا اس کا دنیا سے چلے جانا اس کردار کے خاتمے پہ منطبق ہوا کہ جو سماج کے جبر تلے گھٹ گھٹ کر جیا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ ایسا نہیں ہوا اور یہی وہ تلخ حقیقت کا ادراک ہے جو مجید امجد کے مشاہدے اور تجربے کی بھٹی میں جل کر اس نظم کی صورت میں کندن بن گیا ہے۔ بوڑھے پنواڑی کی جگہ ایک کمسن پنواڑی آ گیا ہے۔ زمانے کی گردش اور سرمایہ دارانہ طبقاتی سماج نے ایک اور انسان کو زندگی کے اسی دائرے میں گھومنے پر مجبور کر دیا ہے جس میں صبح شام کرتے ایک پنواڑی عدم کو سدھار گیا تھا۔ ظلم وستم کی آگ پر ایک پتنگا جل گیا تو بقول مجید امجد ایک اور آ گیا۔ یہ کمال ہے کہ اس نظام پر کہ جس میں بادشاہ کا بیٹا بادشاہ اور وزیر کا بیٹا وزیر، کارخانے دار کا بیٹا کارخانے دار، سرمایہ دار کا بیٹا سرمایہ دار ہی بنتا ہے جبکہ چپڑاسی کا بیٹا چپڑاسی، کلرک کا بیٹا کلرک، مزدور کا بیٹا مزدور اور ریڑھے والے کا بیٹا ریڑھابان ہی بن سکتا ہے۔ پنواڑی کا یہ کمسن بالا بھی اسی سیاسی اور سماجی نظام کی سولی پر زندگی بتائے گا جو اسے باپ اپنے ورثے میں دے گیا ہے۔ کیونکہ اس کے باپ کے پاس اس کے سوا دینے کے لیے تھا ہی کیا۔ اب یہ بھی ساری عمر چونا گھولتے، کتھ پگھلاتے اور چھالیا کاٹتے گزارے گا۔ اس بوڑھے پنواڑی کی کٹوری پہ اسی کے عمر کے بوڑھے شراب میں بدمست سرمایہ دار جھولتے ناچتے پان کی گلوری منہ میں دباتے ہچکولے کھاتے لمبی لمبی موٹروں میں سوار ہو کر اپنے تاج محلوں کو روانہ ہوتے تھے اور اب اس کمسن پنواڑی کی بجتی کٹوری پہ انہی بوڑھے بدمستوں کے جواں سال شاہزادے جھومیں ناچیں گے اور خراٹے بھرتی نئی ماڈل کی کاروں میں سوار نشاط خانوں کی سیر کو چلتے جائیں گے اور یہ بھی اپنی عمر طبعی گزار کے اس مسند پہ ایک اور نو

عمر پنواڑی کو بٹھا کر عدم کو سدھار جائے گا اور سماج کے شہر کا یہ چکر کولہو کے بیل کی طرح اسی طرح چلتا جائے گا۔نظم کا آخری بند اسی بات کی غمازی کرتا ہے:

صبح بھجن کی تان منوہر جھنن جھنن لہرائے
ایک چتا کی راکھ ہوا کے جھونکوں میں کھو جائے
شام کو اس کا کمسن بالا بیٹھا پان لگائے
جھن جھن ، ٹھن ٹھن چونے والی کٹوری بجتی جائے
ایک پتنگا دیپک پر جل جائے ، دوسرا آئے

(''پنواڑی''،شبِ رفتہ)

''طلوعِ فرض''میں بھی مجید امجد نے زمانے کے کم وبیش اسی روّیے کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔اس نظم میں جو منظر ہمیں نظر آتے ہیں، مجید امجد نے ان کے درمیان موازنے کی ایک فضا پیدا کی ہے۔صبح کے اس منظر میں طرح طرح کے لوگ اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جارہے ہیں۔اس انبوہ انسانی میں ایک طرف تو کسی کے حسین ہاتھ کی حنا تو دوسری طرف کسی کے محنت کش ہاتھوں کی خراشیں نظر آرہی ہیں۔کوئی بھکارن اپنے میلے میلے دامن کو پھیلائے امداد طلب نگاہوں سے چلنے والوں کو دیکھتی ہے تو ساتھ ہی نالی کا پانی بھی اپنی مرضی کے برخلاف جاروب کش کے جھاڑو کی زد میں ہچکولے کھاتا بہے جارہا ہے۔اس بھیڑ میں شاعر کی ذات بھی شریکِ کاروان زندگی ہے،مگر مالکِ زندان تقدیر کے ہاتھوں پہنائی زنجیر اس کے قدموں کو اپنی مرضی سے آگے بڑھنے سے روک رہی ہے:

شریکِ کاروان زندگانی!
یہ کیا ہے مالکِ زندانِ تقدیر
جوان و پیر کے پاؤں میں زنجیر!

(''طلوعِ فرض'' شبِ رفتہ)

جوان وپیر کے پاؤں میں زنجیر تو ہے مگر کون سے جوان وپیر جو اپنے پاؤں میں تقدیر کی بھاری بیڑیاں پہنے پٹڑیوں اور فٹ پاتھوں پہ پا پیادہ سفرِ زیست کی منزلیں مارنے کی کاوش میں مصروف ہیں۔مگر یہ زنجیریں ان کے پاؤں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں کہ جن کے پاؤں کے نیچے، ان فٹ پاتھوں پر چلتے ان انسان نما جانوروں کی کھالوں اور خون کے مرکب سے بنی چمکتی، لمبی فراٹے بھرتی کاریں ہیں اور وہ ''تقدیر'' کی بیڑیوں سے آزاد گرد اڑاتی آگے بڑھ جاتی ہیں۔اور یہ بندگانِ پابند تقدیر زمانہ ان گرد اڑاتی کاروں کے ساتھ ایک دو قدم دھول کی طرح چلتے ہیں اور پھر اسی دھول کی طرح بیٹھ جاتے ہیں:

چمکتی کار فراٹے سے گزری
غبارِ رہ نے کروٹ بدلی ، جاگا
اٹھا ، اِک دو قدم تک ساتھ بھاگا

(''طلوعِ فرض'' شبِ رفتہ)

اب غبارِ رہ ایک دو قدم سے زیادہ اور بھاگ بھی کتنا سکتا ہے۔نظم کی ان لائنوں میں مجید امجد نے معاشرے کی اس تفاوت کو اجاگر کیا ہے جس میں ایک ہی نوع سے تعلق رکھنے والا انسان مختلف خانوں میں بٹا ہوا ہے۔کوئی بھونرا ہے جو گلستانوں میں پھولوں کے رس چوس رہا ہے تو کوئی کیڑا مکوڑا ہے جو سڑتے جوہڑ کے اندر تعفن زدہ ماحول میں گندا پانی پینے پر مجبور ہے۔بھونرا اور کیڑا جینیاتی ساخت کے اعتبار سے ایک ہی قبیلے کے فرد ہیں مگر ان کی سماجی حیثیت میں جو فرق ہے وہ سب کے سامنے ہے اور بالکل اسی طرح کہ ایک ہی آدم کی نسل کا ایک انسان انواع واقسام کی نعمتوں سے اپنے بھرے ہوئے پیٹ کو مزید سے مزید بھرنے کی فکر میں ہے اور اسی نسل سے تعلق رکھنے والا ایک اور انسان اس بھرے ہوئے پیٹ کے فضلے سے لدی نالیوں کو اپنے خالی پیٹ کی ساری توانائیوں کو یک جا کر کے بمشکل صاف کر پا رہا ہے۔گویا وہ معاشرے اور ماحول کو غلاظت سے پاک کر رہا ہے مگر اس کام پر وہ سماج کا محسن نہیں بلکہ مطعون قرار پاتا ہے اور نچلے طبقے کا فرد گنا جاتا ہے۔سماج کا یہ دوغلا پن مجید امجد کی نظموں میں اضطراریت کا باعث ہے۔اسی یعنی ۴۰ء کی دہائی کی ایک اور نظم ''راجا پرجا'' میں بھی

مجید امجد اسی دو غلے پن کو آشکار کر رہا ہے جہاں کل آسائش راجے کی محل کی زینت اور اس کے اکھاڑے کی داسیاں ہیں اور سارے مصائب اور آلام پرجا کی جھونپڑیوں کا سامان۔

راجے کا کل اور آج!
سارا جہاں محتاج
سُکھ ، دھن ، باج ، خراج
گدی ، مسند ، تاج
تیس برس کا راج

اور دوسری طرف:

پرجا کا آج نہ کل
شاخ نہ پھول نہ پھل
بھٹکے دَل کا دَل
بھوکا ، پیاسا ، شل
لاکھ برس کا پل

(''راجا پرجا''،شبِ رفتہ کے بعد)

نظم کی لائنیں بغیر کسی ابہام کے ایک ایسی کیفیت سامنے لا رہی ہیں جس کے آئینے میں ہمیں حکمرانوں اور محکوموں، جابروں اور مجبوروں، ظالموں اور مظلوموں کے وہ حقیقی عکس نظر آتے ہیں جو نہ صرف اس عہد کے ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں موجود تھے بلکہ اس کے پون صدی بعد کی دنیا میں بھی وہ معاشرت اور معیشت بھرپور طریقے سے پرجا پر راج کر رہی ہے۔ مجید امجد کی مندرجہ بالا نظموں کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی رقم طراز ہیں:

کبھی کبھی ''طلوعِ فرض'' اور ''پنواڑی'' کی سی نظمیں کہہ کر مجید امجد یہ تاثر دیتا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک بے انجام اور بے کار جد وجہد میں ازل سے مصروف ہے اور ابد تک مصروف رہے گا اور

ابد کی حد پر بھی خود کو خالی ہاتھ پائے گا۔ مگر مجید امجد کی اس طرح کی نظموں کا ایک اور رخ بھی ہے اور وہ عامۃ الناس کے ہجوم اور اس کی جد و جہد میں اس عام آدمی کی حیثیت سے اس کی شرکت ہے جسے ایک نیا عالم بسنے اور ایک نئی دنیا آباد ہونے کے مژدے سے زیادہ اس بات سے دلچسپی ہے کہ

یہ نونمبر کی بس جانے کب آئے گی؟

یوں مجید امجد بظاہر بڑے معصومانہ انداز میں مگر دراصل طنز کے چابک کے ایک سن کر دینے والے سناٹے کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ جب تک نئے نظام اور نئے انقلاب گلی میں گزرنے والے ایک عام آدمی کا مقدر نہیں بدلتے، ہر نظام ڈھکوسلا اور ہر انقلاب فریب ہے۔(۲۱)

پچاس کے عشرے میں مجید امجد نے بہت ساری ایسی نظمیں لکھیں کہ جن میں بعض کی زیریں اور بالائی ہر دو سطح پر سماجی، تہذیبی، تاریخی اور سیاسی شعور سے لبریز حقیقتیں موجود تھیں جبکہ بعض نظموں کی ظاہری پرتیں تو سماج کی چیرہ دستیوں پر لب کشا نظر نہیں آتیں مگر ان نظموں میں بین السطور اور زیریں سطح پر مجید امجد کی اضطراری کیفیات کھوجنے سے مل جاتی ہیں۔ جن نظموں میں ہر دو سطحوں پر سیاسی اور سماجی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے ان میں ''مشرق و مغرب''، ''منزل''، ''درسِ ایام''، ''جیون دیس''، ''زندگی اے زندگی''، ''کہانی ایک ملک کی''، ''حرفِ اوّل'' اور ''جاروب کش'' خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ مجید امجد کی نظمیں ایک واضح آدرش اور ایک ٹھوس نقطۂ نظر کی حامل ہیں۔ بقول خاطر غزنوی:

> مجید امجد کی شاعری دوسرے شاعروں کی طرح غیر مربوط یا بکھری ہوئی یا آزاد نہیں ہے۔ وہ تو ایک آدرش یا ایک منشور کے تحت قلم کو کاغذ کا وصل بخشتا رہا۔ ان کی ہر نظم اور غزل کا ہر شعر تسبیح کے رنگا رنگ دانوں کی حیثیت رکھتا ہے جو ایک دھاگے میں پرو دیے گئے ہیں۔(۲۲)

''مشرق و مغرب'' ۱۹۵۱ء میں لکھی گئی نظم ہے۔ اس کا موضوع بھی وہی سماجی اور معاشی ناہمواری ہے جو دنیا بھر میں بلاتفریق ملک و ملت پھیلی ہوئی ہے۔ جس کا محیط اس قدر لامحدود ہے کہ مشرق و مغرب کی تمیز ہی باقی نہیں رہی ہے۔ اس نظم میں مجید امجد کے لب و لہجے میں ان کے عمومی مزاج

کے برعکس ایک طرح کی تندی موجود ہے۔جب اس دنیا جو انبارِ سیم وزر کا منظر پیش کر رہی ہے، کا نوحہ لکھتے ہیں تو ہمیں اس نظم کا حرف حرف، لفظ لفظ اور سطر سطر چیختی ہوئی نظر آتی ہے:

نہ خواب مشرق

نہ سحر مغرب

بس اک چھلکتی گداز مٹی

کی چادرِ سبز ، جس کے دامن

میں کل تھے انبانِ گندم و جو

اور آج انبارِ سیم و آہن

(''مشرق ومغرب''،شب رفتہ کے بعد)

زمان ومکان کی حدوں سے ماورا، جبر زدہ ماحول سے خوف زدہ انسان ایک طرف تو دووقت کی روٹی کے لیے پریشان ہے تو دوسری طرف شہر ودشت میں پھیلی ہوئی حرص کی لڑائیاں ہیں جن کے گرز وسنان وخنجر کی زہریلی نوکیں انسانیت کے سینے میں پیوست ہورہی ہیں۔نظم کے تیسرے بند میں مجید امجد کا لب ولہجہ نسلِ آدم کی ان کراہوں کا ہم زبان نظر آتا ہے جو مشرق ومغرب کے امتیاز سے بالاتر ہر اس انسان کا مقدر ہے جو صاحبِ سیم وزر کے مرتبہ اولیٰ تک پہنچنے کی سکت نہیں رکھتا:

نہ کوئی مشرق

نہ کوئی مغرب

مگر وہ اِک زینۂ مراتب

جو اَن گنت ، بے زباں غلاموں

کی ٹوٹتی پسلیوں ، پہ ، کل بھی

ہزار کف در دہاں خداؤں

کے بوجھ سے کچکچا رہا تھا

اور آج بھی اِک وہی ترازو
کہ جس میں زنجیر پوش روحوں
کے شعلہ اندام دست و بازو
بہ مُزدِ یک اشک ، تُل رہے ہیں
اگر یہی تھا نصیبِ دوراں
یہ نالۂ غم ، یہ اِک مسلسل
خروشِ انبوہِ پابجولاں
ازل کی سرحد سے نسلِ آدم
کی یہ کراہیں ، جو روز و شب کے
عمیق سناٹے سے پیہم
اُبھر رہی ہیں ، یہ چشم و لب کے
فسانہ ہائے سرشک و شیون
اگر مقدر یہی تھا اپنا
تو یہ مقدر یقین جانو اٹل نہیں تھا

(''مشرق ومغرب''،شبِ رفتہ کے بعد)

مجید امجد کی اس دردمندی کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

مجید امجد کی دردمندی اس کا ایک شخصی فعل ہے جو اس کے باطن کے اظہار کا ایک زاویہ ہے۔ اس کے پس منظر میں مجید امجد کا یہ احساس واضح دکھائی دیتا ہے کہ کائنات کے جملہ مظاہر قاشوں، صنفوں، نمونوں اور چہروں میں منقسم ہونے کے باوجود ایک ہی پراسرار حقیقت کے مختلف انگ ہیں۔ اور جب ان میں سے کسی ایک انگ کو تکلیف پہنچتی ہے تو لازم ہے کہ دوسرے انگ بھی اس سے متاثر ہوں گے۔ مجید امجد اپنی زندگی میں اور پھر اپنی شاعری میں اسی عظیم ولازوال کائنات ہی کا علامتی روپ

بن کر ابھرا ہے۔ اور اسی لیے اس نے خود کو اس کائنات کے ہر انگ سے جڑا ہوا پایا ہے۔ پھر جب کوئی درخت کٹتا ہے، کوئی چیونٹی پاؤں تلے آئی ہے، کوئی بچہ حادثے کا شکار ہوا ہے، کوئی پھول مسلا گیا ہے یا کوئی پرندہ، شخص یا طبقہ ظلم کا نشانہ بنا ہے تو مجید امجد کو یوں لگا ہے جیسے اس کے بدن کا کوئی حصہ زخمی ہو گیا ہے۔(۲۳)

''منزل'' ایک ایسی نظم ہے جس میں مجید امجد نے سلطنتِ خداداد پاکستان کو موضوع بنایا ہے۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

اس ایک بات سے انکار ہو نہیں سکتا
کہ ہم نے اپنے لہو سے، بساطِ عالم پر
لکیر کھینچی ہے جس سلطنت کی، اس کا وجود
ہے ایشیا کے شبستاں میں صبحِ نو کی نمود

(''منزل''،شبِ رفتہ کے بعد)

مجید امجد نے ان سطروں میں ارضِ پاکستان کو ایک جغرافیائی تقسیم ہی قرار نہیں دیا بلکہ اس ملک کے قیام کو شبستان ایشیا میں نمودِ صبح قرار دیا ہے۔ صبح نو کی نمود ایک بلیغ جملہ ہے جس میں اس ملک کے قیام کے وہ سارے اغراض و مقاصد اور وہ ساری غائتیں پوشیدہ ہیں جن کو اپنے ذہن و دل میں سجائے ہندوستان کی ایک بڑی آبادی نے اس صبحِ نو کو تاریکی کے چنگل سے نکالنے کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ لیکن وہ سوال کہ جو مجید امجد کے معاصر تخلیق کاروں نے اٹھایا تھا، جنھوں نے اس صبح نو کو شب گزیدہ اور دھندلکے کی مانند سمجھا تھا۔ مجید امجد نے بھی اس صبح نو کے ظہور پر سوال اٹھایا ہے۔ اس بات کو مان کر بساطِ عالم پر اپنے لہو سے کھینچی گئی لکیر سے ایشیا کے شبستان میں جس ملک کی داغ بیل ڈالی گئی تھی وہ اگر چہ آمدِ صبح نو کی امید تھی مگر! مگر کیا یہ امید بر آئی۔ اس کا جواب وہ نظم کے دوسرے اور مرکزی بند میں بڑی صراحت کے ساتھ دیتے ہیں۔ ہندوستان کا ہر باخبر، ہر ایک کوچہ بازار، ہر وہ قافلہ کہ جسے مہلت سفر نہ ملی، ماؤں کے جگر کے ٹکڑوں کی ڈوبتی فریادیں اور چیختے آنسو جو دشت و چمن کی فضاؤں میں اب تک گونج رہے ہیں، اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ نمودِ سحر نے

کس قدر رخراج وصول کیا۔مگر اس خراج کے بعد کیا اہل چمن کو بہار نصیب ہوئی اس کا جواب مجید امجد کی زبانی سنیے:

ہمارے محلوں کے نغمے ، ہمارے باغوں کے پھول!
مگر یہ پھول ، یہ نغمے ، یہ نکہتوں کے ہجوم
سحر سحر کو اگر مشکبار کر نہ سکے
نفس نفس کو امینِ بہار کر نہ سکے
وہ جن کے واسطے یہ گلستاں سجایا گیا
گر اس طرح تہی داماں ، تہی سبو ہی رہے
تو سوچ لو کہ یہ نازک ، لطیف پرتوِ نور
یہ لڑکھڑاتی ہواؤں میں ٹھہرا ٹھہرا غرور
ہزار ساعت بے برگ کے بیاباں میں
یہ اک امنگوں بھری سانس!
اس کا مستقبل؟
ہماری زندگیوں سے اِک اِک تڑپ لے کر
پروئے ہیں جو فلک نے، بہ سلکِ شام و سحر
گلوئے غم کے لیے ، چہرۂ طرب کے لیے
سدا بہار ارادوں کے ہار
اِن کا مآل؟
یہی سوال ہے رازِ غمِ زمان و زمیں!
حضور! ان کا جبیں پر شکن جواب نہیں

(''منزل''،شبِ رفتہ کے بعد)

مجید امجد کے سیاسی شعور کی بنیادیں اس تاریخی شعور سے اٹھتی ہیں جو ان کے علم، مطالعے اور اکتساب زندگی نے دیا تھا۔ تاریخ کے سیل رواں کے آگے اس دنیا کی بے بسی اور اس بے بس دنیا میں بسنے والے وارثانِ تخت وکلاہ کی خوش فہمی کا پتا ان کے اسی تاریخی شعور کی وساطت سے ہے۔ مجید امجد تاریخ کے ان گوشوں سے واقف تھے جنھیں بے رحم گوشے کہنا چاہیے۔ تاریخ کی بے رحمی کا حل کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ اس کا ایک تھپیڑا اوجِ ثریا پر متمکن صاحبان عالی مرتبت کو پاتال کی پہنائیوں میں پہنچا دیتا ہے۔ مجید امجد کا مجموعی شعری لہجہ اگرچہ افسردگی کی کیفیت سے بھرپور ہے مگر جب وہ تاریخ کے دریچوں سے زمانۂ گذشتہ کا نظارہ کرتے ہیں اور انھیں وقت کے منہ زور گھوڑے کے سامنے بڑے بڑے بُرج روندے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں تو پھر وہ اپنے عہد کے صاحبان کج کلاہ پر معنی خیز نگاہ ڈالتے ہیں۔ مجید امجد کی یہ معنی خیز نگاہ گویا ان اقتدار پر ایک گہرا طنز ہے جو اندر سے کھوکھلی ہیں اور جن کی بنیادیں کائناتی حقیقتوں کے بجائے محض خوش فہمیوں پر استوار ہیں۔ جو اپنے محلوں کی فصیلوں میں انسانوں کی ہڈیاں پرو کر اس خوش فہمی میں ہوتے ہیں کہ اب ان کا راج سنگھاسن تا ابد قائم ہے۔ مگر سیل زماں کا ایک ہی وار ان خود ساختہ کھوکھلے قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے۔ ''درسِ ایام'' میں مجید امجد نے آج کی سامراجی قوت اور ان کے نمک خواروں کو ماضی کے آئینے میں ان کی اپنی شکل دکھلائی ہے۔ انھیں ان حقیقتوں سے شناسائی دی ہے جو ابدی ہیں کہ ایک مالکِ کائنات کے سوا تخت وکلاہ وقصر کا ہر ایک سلسلہ ایک نہ ایک دن ختم ہونے والا ہے۔ اس نظم کے دو بند ہیں جو گویا دو نقش ہیں ایک ماضی کا اور ایک حال کا۔ ماضی کا نقش مجید امجد نے اپنی اس بات کو تقویت دینے کے لیے حوالے کے طور پر پیش کیا ہے جس میں وہ اس عہد کے صاحبانِ اقتدار کو ان کی حقیقتوں سے آگاہ کر رہا ہے:

سیلِ زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر تھی
تخت و کلاہ و قصر کے سب سلسلے گئے
وہ دست و پا میں گڑتی سلاخوں کے رُوبرو
صدہا تبسّموں سے لدے طاقچے گئے

دامن تھے جن کے خون کے چھینٹوں سے گلستاں
وہ اطلس و حریر کے پیکر گئے ، گئے
ہر کنج باغ ٹوٹے پیالوں کا ڈھیر تھی
سیلِ زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر تھی

(''درسِ ایام''،شبِ رفتہ)

یہ سطریں اصل میں تنبیہ کےطور پر''درسِ ایام'' کا حصہ بنی ہیں اور یہ تنبیہ زمانۂ حال کے ان اہلِ تخت وتاج کے لیے ہے جو اپنے جاہ ومنصب کو دائمی اور اپنے علاوہ باقی ہر ایک شے کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ نظم کی اگلی سطروں میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے:

سیلِ زمانے کے ایک تھپیڑے کی دیر ہے
یہ ہات ، جھرّیوں بھرے ، مرجھائے ہات ، جو
سینوں میں لٹکے تیروں سے رِستے لہو کے جام
بھر بھر کے دے رہے ہیں تمہارے غرور کو
یہ ہات ، گلبن غم ہستی کی ٹہنیاں
اے کاش! انہیں بہار کا جھونکا نصیب ہو
ممکن نہیں کہ ان کی گرفتِ تپاں سے تم
تا دیر اپنی ساعدِ نازک بچا سکو
تم نے فصیل قصر کے رخنوں میں بھر تو لیں
ہم بے کسوں کی ہڈیاں لیکن یہ جان لو
اے وارثانِ طرۂ طرفِ کلاہ کے!
سیلِ زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر ہے

(''درسِ ایام''،شبِ رفتہ)

نظم کی یہ سطریں ان 'وارثانِ طرہ طرف کلاہ گئے' کی سلطنت میں خام مال بننے والے انسانوں میں اس احساس کے پیدا ہونے کی خواہش کا اظہار کرتی ہیں جو نہ صرف مجید امجد کی خواہش ہے بلکہ اس سماج کے ہر اس فرد کی تمنا ہے جو حکمرانوں کی حکمرانی کے کارخانے کا ایندھن ہے۔ مجید امجد شہنشاہوں کے جامِ غرور کو بھرنے والے ان ہاتھوں میں ردِ عمل کی توانائی دیکھتے ہیں۔ انھیں محض خواہش ہی نہیں ہے بلکہ یقین ہے کہ گلبنِ ہستی کی ان ٹہنیوں کو جب بہار کا جھونکا نصیب ہوگا تو ان کی تازگی، روئیدگی اور توانائی کے سامنے کوئی ساعدِ نازک ٹھہر نہ سکے گی۔ گویا مجید امجد اس فرد کے اندر غیرتِ انسانی کے جوہر دیکھ رہے ہیں جو صدیوں قرنوں سے محکومی کے جبر کا شکار ہے جس کی ہڈیاں محلوں کی دیواریں چننے میں کام آتی ہیں۔ ایک دن سیلِ زماں انہی محلوں کے وارثان کی جگہ اسے مسند نشین کرے گا کیونکہ یہی قانونِ فطرت ہے جو ابنائے زمانہ کی سیاست بازی پر حاوی ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

(۱) ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، ''مجید امجد: اکیسویں صدی کا شعور'' مشمولہ ''مجید امجد۔ایک مطالعہ''، مرتبہ: حکمت ادیب، جھنگ ادبی اکیڈمی، جھنگ، ۱۹۹۴ء، ص ۵۷۲

(۲) عشرت رومانی، ''شعورِ عصر''، بزمِ تخلیقِ ادب پاکستان، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۲۶۸

(۳) اسلم انصاری، دیباچہ ''مجید امجد: بیاضِ آرزو بکف'' از سید عامر سہیل، ص ۱۱

(۴) ایضاً، ص ۱۰

(۵) وزیر آغا، ڈاکٹر، ''نئے تناظر''، آئینۂ ادب، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۶

(۶) جیلانی کامران، ''اردو نظم میں جدید رجحانات'' (نظم) مشمولہ ''مقالات کل پاکستان اہل قلم کانفرنس، ۱۹۸۱ء'' اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۱ء، ص ۳۱۶

(۷) سید عامر سہیل، ڈاکٹر، ''مجید امجد: بیاضِ آرزو بکف''، ص ۴۷

(۸) بلراج کومل، ''مجید امجد ایک مطالعہ'' مشمولہ ''مجید امجد ایک مطالعہ'' مرتبہ: حکمت ادیب، ص ۲۷۳

(۹) یحییٰ امجد، ''پاکستانی عوامی ادبی کلچر کا پیش رو'' مشمولہ ''مجید امجد۔ایک مطالعہ'' مرتبہ: حکمت ادیب، ص ۲۶۲

(۱۰) حمید نسیم، ''کچھ اور اہم شاعر''، فضلی سنز، کراچی، س ن، ص۹۰

(۱۱) یحییٰ امجد، ''پاکستانی عوامی ادبی کلچر کا پیش رو'' مشمولہ ''مجید امجد ـ ایک مطالعہ'' مرتبہ: حکمت ادیب، ص۲۶۳

(۱۲) انور سدید، ڈاکٹر، ''جدید اردو نظم کا ایک اہم شاعر: مجید امجد'' مطبوعہ ''اوراق'' لاہور، جنوری فروری ۲۰۰۰ء، ص۱۹

(۱۳) ابرار احمد، ڈاکٹر، ''جدید اردو نظم: پاکستانی تناظر میں'' مطبوعہ ''معاصر شاعری'' شمارہ: ۱، نومبر ۲۰۰۶ء، ص۱۲

(۱۴) عامر سہیل، ڈاکٹر، ''مجید امجد کی شعری لفظیات کا مطالعہ'' مطبوعہ ''دریافت''، شمارہ ۶، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ص۷۸۰

(۱۵) فخر الحق نوری، ''مجید امجد کا تصورِ وقت'' مطبوعہ ''ماہِ نو'' لاہور، اپریل ۱۹۹۰ء، ص۲۴

(۱۶) سید عامر سہیل، ڈاکٹر، ''مجید امجد: بیاضِ آرزو بکف''، ص۸۸

(۱۷) ایضاً، ص۸۹

(۱۸) تاج سعید، ''حرفِ آغاز'' مشمولہ ''لوحِ دل'' (کلیاتِ مجید امجد) مرتبہ: تاج سعید، مکتبۂ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۱۳

(۱۹) ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، ''مجید امجد کی نظموں میں اجل'' مطبوعہ ''اوراق'' لاہور، جولائی اگست ۱۹۹۹ء، ص۲۴۰

(۲۰) سید عامر سہیل، ڈاکٹر، مجید امجد: بیاضِ آرزو بکف، ص۹۰

(۲۱) احمد ندیم قاسمی، دیباچہ ''لوحِ دل (کلیاتِ مجید امجد)''، مرتبہ: تاج سعید، مکتبہ ارژنگ، پشاور، ۱۹۸۷ء، ص۲۰

(۲۲) خاطر غزنوی، پیش لفظ ''مرے خدا، مرے دل'' (کلیاتِ مجید امجد) مرتبہ: تاج سعید، آئینۂ ادب، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص۱۹

(۲۳) وزیر آغا، ڈاکٹر، ''مجید امجد: ایک دلِ دردمند'' مطبوعہ ''اوراق'' لاہور، اگست ۱۹۹۰ء، ص۳۰۲